



یہ جہان کہنہ جسے ہم مغربی نقشے پر بنی ہوئی ایک دنیا کے طور پر دیکھتے ہیں... کچھ عظیم الشان تبدیلیوں کے دھانے پر کھڑا ہے۔ کچھ صبر اور حوصلہ سے کام لے کر، جو قوم آج اپنی بنیادوں پر کھڑی رہی وہ آنے والے سالوں اور عشروں میں تعمیر ہونے والی دنیا کی ایک اہم ترین کھلاڑی ہوگی۔ البتہ جو قوم اس ہڑ بونگ میں، جو فی الوقت جاری ہے، اپنا آپ کھو بیٹھی اور اپنی بنیادوں سے ہاتھ دھو بیٹھی، وہ آنے والے عشروں میں تعمیر ہونے والی دنیا کے اندر صرف بلبے کے طور پر کام آنے والی ہے۔

یہ گرد، جس کے فی الحال اور بھی اٹھنے کا امکان ہے، یہاں تک کہ خدشہ ہے اس میں سانس لینا دشوار ہو جائے، بلکہ سانس بحال رکھنا دو بھر ہو جائے... اس گرد کے دبنے کے ساتھ ہمیں ایک بے حد مختلف دنیا دیکھنے کو ملنے والی ہے، اتنی مختلف جو ہمارے تصور سے بالاتر ہو۔ اس دنیا کا 'مختلف' ہونا سب سے بڑھ کر اسی پہلو سے ہے کہ یہاں "عالم اسلام" کا کیا مستقبل ٹھہرتا ہے؛ کیونکہ اسی کا مستقبل آنے والے دنوں کا اصل سوال ہے۔

ہم اس سے پہلے متعدد بار کہہ چکے کہ "عالم اسلام" سے نمٹنا مغرب کے تعمیر کردہ اس جہان کہنہ کو 'دائمی' بنانے کے لیے "کمپوزم" سے بڑھ کر اہم ہے۔ عالم اسلام کا معاملہ 'سرے' لگانے کا یہ ہدف اُن کے یہاں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے موخر چلا آرہا ہے تو اس کی وجہ یہ کہ کچھ دوسرے اہداف زیادہ فوری نوعیت کے یکے بعد دیگرے سامنے آتے چلے گئے تھے۔ مسلم ہند میں 1857 کے 'غدر' پر قابو پانے اور دیگر مسلم

براعظموں پر تسلط مضبوط کر لینے کے بعد، انیسویں صدی کا نصف دوم ابھی ابتدائی تیاریوں ہی میں گزرا تھا، اُس کے کالج اور یونیورسٹیاں ابھی پوری طرح تعمیر بھی نہ ہوئی تھیں، کہ اتنے میں 'عالمی جنگوں' کی گھٹائیں اٹھ آئیں۔ ان سے نمٹنے میں بیسویں صدی کا نصف اول پورا گزرا، اور جس کے نتیجے میں 'تیسری دنیا' بھی ہاتھ سے پھسل گئی، کہ اتنے میں کمیونزم کا عفریت 'سپر پاور' بن کر سامنے تھا جو آدھا گلوب نگل چکا تھا اور باقی کے لیے اپنے جبرے کھولے کھڑا تھا، جس نے بیسویں صدی کا نصف دوم بھی لے لیا۔ اب البتہ... قبل اس کے کہ کوئی اور بڑی رکاوٹ آکھڑی ہو، میدان میں صرف عالم اسلام ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے پوری یکسوئی!

اُس ڈیڑھ صدی کی کسر نکالنے کا وقت اگر آج ہے تو یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ یہ گرد جو کمیونزم کو دفن کرنے بعد سے اٹھی ہے اور جس کا میدان عالم اسلام ہے، اتنی آسانی سے بیٹھ جانے والی ہے!

توقع یہی ہے کہ مغرب عالم اسلام کو مستقل طور پر 'تیسری دنیا' بنا رکھنے کے بڑے محکم اور جاندار انتظامات کرے گا، جس میں کچھ علاقائی شکاری بھی اس بار اُس کے شانہ بشانہ ہیں۔ بلاشبہ اس وقت عالم اسلام پر جو ضربیں لگ رہی ہیں، خصوصاً اذہان اور عقول کی دنیا پر، وہ غیر معمولی ہیں۔ اس پر مغرب کی جتنی لاگت آرہی ہے (فی الحال کسی 'لمبی چوڑی آمدن' کے بغیر جو فوجی خرچے کیے جا رہے ہیں، نیز دانشوروں کے جتنے بڑے بڑے غول ہم پر چھوڑے جا رہے ہیں) وہ حیران کن ہے... خصوصاً ایک ایسے وقت میں جب مغرب کی اپنی زندگی اور توانائی اختتام کے قریب ہے۔ شاید آخری ترین 'ریزرو' کام میں آرہے ہیں! بلکہ 'قرض کی مے' چل رہی ہے! یہ کہنے میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہو کہ مغرب عالم اسلام میں اپنی تاریخ کا سب سے بڑا جوا کھیل رہا ہے! کچھ فوری اقدامات سے عالم اسلام اگر گھائل نہیں ہوتا اور اس کے 'اٹھ کھڑے ہونے' کے امکانات، جو کہ بے تحاشا ہیں، اگر ختم نہیں ہو جاتے، تو البتہ یہ مغرب کے لیے بے حد فکر مندی بات ہے اور مغرب کے ساتھ ساتھ اُس کے 'ریجنل' حواریوں کے پریشان

ہو جانے کی بھی۔ لہذا یہ جنگ نہایت شدید اور بے رحم ضرور ہے، خصوصاً اس لیے کہ فریق مخالف کے پاس اس بار وقت بہت کم ہے اور اس جنگ کو جلد از جلد اختتام کو پہنچانا اُس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ البتہ ہم اگر اس جنگ میں ”اپنا آپ“ بچا لینے میں کامیاب رہتے ہیں، خصوصاً اپنے اُن فکری ثوابت کے معاملہ میں جو یہاں ایک جہانِ نو تعمیر کرنے کی پوری قدرت اور استعداد رکھتے ہیں اور انسانیت کو عدل و انصاف سے ہمکنار اور ایک ”حقیقی“ دنیا سے آشنا کروانے کی امکانی طاقت رکھتے ہیں... تو اس جنگ کی گرد بیٹھنے کے ساتھ ہی دنیا کو اتنی غیر متوقع حقیقتیں دیکھنے کو مل سکتی ہیں جو شاید اس کے سان گمان میں نہ ہوں!

اس سیناریو میں... وقت کے ائمہِ معلّم بڑی دیر سے امت کو اس کی ترجیحات وضع کر کے دے چکے ہیں جو کہ بنیادی طور پر دو ہیں:

1. خارجی سطح پر؛ عالم اسلام پر حملہ آور صلیب، صیہون اور ہندوس وغیرہ لشکروں کے خلاف امت کی مزاحمت کو میدان میں لانا؛ جو کہ نہ صرف حملہ آور ہاتھیوں کو ڈھانے (ان کو ’روس‘ کے انجام سے دوچار کرنے) کا ایک طویل المیعادی پراجیکٹ ہے بلکہ خود عالم اسلام کو جگانے اور داخلی استحکام سے ہمکنار کروانے کا ایک موثر و کامیاب ذریعہ ہے، اگرچہ وقتی طور پر اس کے لیے ہمیں کتنی ہی قربانیاں دینا پڑیں... اور

2. داخلی سطح پر؛ امت کے فکری ثوابت اور مسلمت پر ڈٹ کر دکھانا؛ جو کہ مغرب کے تخلیق کردہ اس مصنوعی ’جہانِ نو‘ میں گم ہو جانے سے ہمارا اصل تحفظ ہے اور مستقبل قریب میں (بفضل خدا) ایک حقیقی ”جہانِ نو“ تعمیر کرنے کے لیے ہمارا اصل سرمایہ، اگرچہ وقتی طور پر ہمارے یہ فکری ثوابت اور ہمارے یہ عقائدی مسلمت تطبیق اور تنفیذ سے کتنے ہی محروم کیوں نہ ہوں۔ مض ان کا زندہ رہنا اس جہانِ نو۔ این کا ایک بہت بڑا واقعہ ہو گا اور حالیہ طوفانوں کو دیکھیں تو شاید ہماری تاریخ کا سب سے بڑا چیلنج۔ ہمارے یہ فکری ثوابت اور مسلمت شاید

آج مصر قدیم کے اُس ”شیر خوار بچے“ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو کچھ دیر ایک نازک تابوت میں پڑا طوفانی موجوں کے ہچکولے کھاتا رہا مگر وہ ”شیر خوار“ اپنی نہاد میں فرعون کے محلات خاکستر کرنے کی استعداد رکھتا تھا اور جس کے لیے اپنا ”وقت“ آنے تک ”محفوظ“ رہنا وقت کا سب سے بڑا چیلنج بن چکا تھا!

یہ دو محاذ اتنے بڑے ہیں کہ امت کی توانائیوں کو ان کے علاوہ کسی اور محاذ کی راہ دکھانا خود ان محاذوں کے ساتھ نیز اس تھکی ہاری امت کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یہ بات جو اہل علم بڑی دیر سے کہہ چکے، اس کی صداقت ’تجربات‘ سے خود بخود سامنے آتی جا رہی ہے، گو ان ’تجربات‘ کی قیمت نے ہماری کمر دہری کروادی ہے۔ اب بھی اگر اپنی رہی سہی توانائیوں کو انہی دو محاذوں پر مرکوز کر دیا جائے تو دشمن کے خلاف اپنی تاریخ کی اس بدترین جنگ میں امت کو پیشرفت کرانا ہمارے لیے ممکن ہو جاتا ہے۔

تاریخ کی اس بدترین ہڑ بونگ میں... چین، بھارت اور لاطینی امریکہ وغیرہ ممالک کے برعکس؛ عالم اسلام وہ خطہ ہے جو استحکام سے ابھی کوسوں دور ہے۔ باقی سب خطے ایک ایک کر کے استحکام پاتے گئے اور بھیڑیوں کی چیر پھاڑ سے نسبتاً محفوظ ہوتے چلے گئے (بلکہ خود بھیڑیے بنتے گئے؛ کہ اس یو۔ این جنگل کا یہی دستور ہے جو عربوں نے اپنے زمانہ جاہلیت میں دریافت کر لیا تھا: *إن لم تکن ذئباً أكلتک الذئاب!*¹)۔ آج اگر عالم اسلام بھی اپنا آپ سنبھال لیتا ہے تو تیسری دنیا کا فنا منا تقریباً ختم ہو جاتا ہے، (محض افریقہ کے چند غیر مسلم ممالک ’عالمی طاقتوں‘ کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی ہیں، خصوصاً جبکہ ’کھانے‘ والے بہت زیادہ ہو گئے ہوں!)۔ پس آج اگر عالم اسلام اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دنیا میں لوٹ کھسوٹ کا دور ختم؛ اب وسائل کی چوری ممکن نہ رہے گی اور ہر کسی کو اپنی اپنی کر کے کھانا ہوگی؛ جو کہ نہ ماننے والی بات ہے! جبکہ اس وقت حال یہ ہے کہ جس جس نے داخلی استحکام پا کر اپنا آپ سنبھالا ہے وہ

¹ عربی ضرب المثل، ترجمہ: ”اگر تم خود بھیڑیا نہیں تو پھر بھیڑیوں کی خوراک ہو“۔

بھی عالم اسلام کے وسائل میں 'حصہ' بٹانے کے لیے پر تو لنے لگا ہے! یعنی آج ہمارے 'طلبگار' پہلے سے بڑھ گئے ہیں۔ ہمارا سنبھلنا جن جن کے لیے پریشان کن ہے وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ ہماری زمینیں، ہماری طبعی دولت، ہماری منڈیاں، ہمارے مزدوروں کے عضلات آج حقیر سے حقیر 'ریجنل پاور' کی رال ٹپکانے لگے۔ اور تو اور صدیوں مسلمانوں کا محکوم رہنے والا ہندو آج ہمیں اپنی منڈی کے طور پر دیکھنے لگا...! جس کا مطلب یہ ہے کہ استحکام پانے کی راہ میں آج ہمارے سامنے پہلے سے کہیں بڑھ کر رکاوٹیں اور کہیں زیادہ حریف ہیں۔ ہمیں 'کھانے' کے لیے منہ سنوارنے والے آج پہلے کسی بھی دور سے بڑھ کر ہیں؛ اور اپنا آپ کھڑا کر لینا ہمارے حق میں پہلے کسی بھی دور سے بڑھ کر چیلنج۔ یہ بھی اُس صورت میں جب اس مسئلے کی صرف 'معاشی' تفسیر کی جائے اور اس پورے ہنگامے کو محض 'وسائل کی دور' کی نظر سے دیکھا جائے۔ البتہ اگر آپ عالم اسلام کو "مومنین بنی اسرائیل" کے اُن پسماندہ مخلوق کے طور پر بھی دیکھتے ہیں جہاں پلتے 'خطرات' سے فرعون اور ہامان کی نگاہ کبھی ایک لمحے کے لیے نہیں ہٹتی، تو پھر "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَتَّةَ عَلَيْكُمُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ قَبْلِكُمْ لَسُوْا فِيْهَا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَتَّةَ عَلَيْكُمُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ قَبْلِكُمْ لَسُوْا فِيْهَا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَتَّةَ عَلَيْكُمُ" کے سوا یہاں اُن کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا، جس کی فی زمانہ ہزار ہا صورتیں ہیں!

پس اس وجہ سے آج آپ ایک ایسے چیلنج میں گھر گئے ہیں جہاں خدا کے سوا کوئی آپ کی مدد کو نہیں آسکتا... اور خدا کی مدد کو آواز دینا اپنا ایک طریقہ اور دستور رکھتا ہے (حق یہ ہے کہ ہر کسی کی مدد کو آواز دینا ایک خاص طریقہ اور دستور رکھتا ہے؛ اور آدمی کو دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ کس کی "شرائط" کو اپنے حق میں آسان اور قابل عمل پاتا اور کس کی مدد کو اپنے "شامل حال" دیکھنا چاہتا ہے)۔ یہ البتہ طے ہے کہ آپ اپنی تاریخ کے بدترین محاصرے میں ہیں۔ یہاں محض ذہانت اور پلاننگ کچھ کرنے والی نہیں جب تک خدا کی نصرت کا بھی ساتھ بندوبست نہ کر لیا جائے اور جو کہ کبھی بھی ہماری پہنچ سے دور نہیں رہی، صرف اُسے آواز دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ 'ذہانت اور منصوبہ بندی' کا انتظام تو شاید ہمارے حریف کے پاس ہم سے بڑھ کر ہو! آج ہمیں عمر بنی اللہ کی وہ نصیحت

یاد کرنے کی ضرورت ہے جو وہ اپنے کمانڈروں کو فرمایا کرتے تھے: کہ خیال رکھو تم اپنے دشمن پر تعداد اور تیاری کے بل پر فتح نہیں پاتے بلکہ فتح اس بنیاد پر پاتے ہو کہ تمہارا دشمن خدا کا نافرمان اور تم خدا کے فرماں بردار ہو؛ پس اگر تم بھی خدا کے نافرمان ہوئے اور تمہاری یہ برتری جاتی رہی تو پھر یاد رکھو تعداد اور تیاری کے میدان میں تو تمہارے دشمن کا ہی پلڑا بھاری ہے۔ آج جو بحران ہمیں درپیش ہے، اگر ہم صرف اس کی سنگینی کا ہی درست اندازہ کر لیں... تو یہ ہمارے حق میں کسی اہم پیش رفت سے کم نہ ہو؛ لیکن شاید اس کے لیے ایمان کی نظر ضروری ہے ورنہ پسر نوح کی نظر سے دیکھیں تو مسئلہ محض ایک 'پہاڑ چڑھ لینے' کی مار ہے! محض کچھ 'منصوبہ بندی'، کچھ 'پڑھے لکھے' رویے اور 'پڑوسیوں' سے اچھے تعلقات؛ اور ہمارا بیڑا پار ہے!

(گو ہماری اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ "ذہانت اور منصوبہ بندی" کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں؛ "عملی منصوبہ بندی" اور "نصرتِ خداوندی کو آواز دینا" دو متعارض چیزیں نہیں کہ ان میں سے ایک کا سوال دوسرے کی نفی کی قیمت پر ہو!)

البتہ وہ نسخے جن کو ہم نے استحکام کاراز سمجھا ہمارا سب کچھ اجاڑ گئے اور آج ہماری بے بسی اور کس پرسی دیدنی ہے۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی! عالم اسلام مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک آج ایک کھلی منڈی ہے جس پر طرح طرح کی کھیاں جھنڈنا رہی ہیں۔ واضح رہے، یہاں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے 'مولوی' نے حکومت نہیں کی جو اس خاک اڑتی صورت حال کی ذمہ داری اس پر ڈالی جائے، جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ سب زمام کار یہاں کی 'پرو۔ ویسٹ' قیادتوں کے پاس تھی اور انہی کے نسخے انہی کے ہاتھوں آزمائے جاتے رہے... جس کے نتیجے میں 'انجامِ گلستاں' آج تقریباً سامنے ہے؛ یہاں تک کہ اس کی بابت کچھ بہت زیادہ قیافہ آرائیوں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی!

یہ سب کچھ 'پرو۔ ویسٹ' قیادتوں کے زیر انتظام ہوا... تو بھی البتہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اب یہاں کا سب کچھ 'مولویوں' کے سپرد ہو جائے؛ اور نہ ہمارے کہنے سے ایسا ہونے والا ہے! نہ ہمارے نزدیک یہ فی الواقع اس مسئلہ کا کوئی حل ہے۔ بلکہ ہمارا دوسرا

مقدمہ ہی یہ ہے² کہ اس مسئلہ کا فوری حل کسی کے پاس نہیں ہے۔ نہ کسی ایک الیکشن لڑ لینے سے یہ پانسہ پلٹ جانے والا ہے۔ نہ امت اس حالت میں ہے کہ فوری طور پر اس کے لیے ایک عدد خلافت کا بندوبست کر لایا جائے اور اسی چیز کو وقت کا سب سے اہم پراجیکٹ قرار دے کر امت کے باقی منصوبوں کو اس پر موقوف ٹھہرایا جائے۔ نہ لڑ کر یہاں کوئی میدان جیتنے کا ہے۔³ اور نہ رفاہ عامہ کے منصوبے یہاں کا نقشہ بدل دینے والے ہیں۔ نہ کوئی سائنسی انقلاب اور نہ کوئی معاشی پروگرام ایسی چیز ہے جس سے امت کی امیدیں وابستہ کرائی جائیں اور اسی سے امت کے دن پھرنے کی آس رکھی جائے۔ یہاں اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ صالحین جو امت کے درد مند اور حقیقت دین کے امین ہیں⁴، زندگی کے ہنگاموں میں شریک ہوں اور یہاں پر ہی اپنی ”قیادت“ کی

² ہمارا پہلا مقدمہ امت کی اس وقت کی ترجیحات کا بیان ہے جو کہ اوپر دو نقاط میں ذکر ہوا۔

³ تحریکوں میں عجلت پسندی کے رجحانات پر ہم محمد قطب کے افکار متعدد مقامات پر پیش کر چکے ہیں۔ خصوصاً دیکھئے ہماری ترجمہ کردہ محمد قطب کی تالیف ”دعوت کا منبج کیا ہو؟“

⁴ اس حامل دین طبقہ سے ہماری مراد ظاہر ہے نرے دیندار نہیں۔ ”حامل دین“ سے یہاں ہماری مراد وہ طبقہ ہے جو اپنے دور کے شرک کی نفی کرنا جانتا ہو اور اپنے زمانے کے انسان کو ”توحید“ کے مطالب ذہن نشین کر سکتا ہو۔ البتہ جہاں توحید کے بنیادی اسباق روپوش ہوں وہاں محض ’دینی مظاہر‘ سے دھوکہ کھانا گمراہ کن ہے۔ حق تو یہ ہے کہ آج کی اس صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے، کہ جہاں اسلام معاشرے کے ثقافتی رجحانات cultural trends and fashions پر فی الحال چھایا ہوا نہیں ہے وہاں ’مظاہر‘ سے بالکل بھی دھوکہ نہ کھانا چاہئے بلکہ اصل جانچنے کی چیز یہاں تین باتیں ہونی چاہئیں:

1. تصورات کی چٹنگی clarity in concepts (عقیدہ)،

2. اسلام کے بنیادی فرائض basic obligations کی ادائیگی، اور

3. اسلام میں مقرر اخلاقی قدروں moral values کی پابندی۔

یہی تین چیزیں فی الوقت محنت کا اصل میدان ہونا چاہئے، خواہ تعلیم کا چیلنج ہو یا تربیت کا... اور خواہ دعوت کا یا کوئی تحریکی قافلہ تشکیل دینے کا۔ صرف یہ ایک نکتہ واضح ہو جائے تو یہاں مطلوب تحریکی عمل کی ایک بہت بڑی گتھی سلجھ جاتی ہے۔ ”معاشرے میں اترنے“ کا جو عمل ہمارا منتظر ہے، اس میں بھی یہی حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے۔ (مزید دیکھئے ہمارا ایک ادارہ ”پس چہ باید کرد“)

اہلیت ثابت کریں۔⁵ یہاں کے معاشرتی عمل میں حصہ لیں اور اپنی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے سماجی شعبوں میں اوپر تک پہنچیں جس سے خود بخود یہ معاشرے پر

⁵ یہاں اگر ہمارا ”حامل دین“ طبقہ اپنی اہلیت ثابت کر لیتا ہے تو معاملہ خود بخود ایک رخ پالتا ہے۔ اور اگر یہاں پر ہی یہ اپنی اہلیت ثابت نہیں کرتا تو بھی فیصلہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس وقت ہے! البتہ اگر ہماری دینی قیادتوں کا خیال ہو کہ تقریریں اور وعظ کرنے سے معاشرے کی قیادت ہماری جھولی میں آگرے گی تو شاید قیامت تک ایسا نہ ہو! یا اگر ہمارا خیال ہو کہ معاملہ یونہی چلتا رہے مگر کسی ایکشن کے نتائج یکبارگی یہ ’ثابت‘ کر دیں گے کہ اس قوم کی قیادت درحقیقت ہمارا ہی حق تھا تو اس کو خام خیالی کہنا چاہئے۔ یا کسی کا خیال ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر وہ اس قوم کی قیادت کر دکھائے گا تو ہمارے نزدیک یہ خوش امید ہی ہے۔

یہاں سماجی عمل ہی ”قیادت“ کی اصل کسوٹی ہے؛ جو اس میں فیمل ہے وہ فیمل ہے اور جو اس میں پاس ہوتا ہے ان شاء اللہ میدان اُس کا ہے خواہ اُس کی ’حکومت‘ آئے یا نہ آئے یا اس پر ’انقلاب‘ کا ٹھپہ لگے یا نہ لگے۔ ”تبدیلی“ لانے کا یہی ایک فطری راستہ ہے؛ اس سے ہٹ کر اگر کسی کو ہتھیلی پر سروسوں جمانی ہے تو وہ اپنے ان ’عالیشان‘ قلعوں میں جتنی دیر چاہے سکونت رکھے۔ وہ چیز جس کو ہم رسول اللہ ﷺ کا برپا کردہ ”انقلاب“ کہتے ہیں، اس امت کی تاسیس اور تشکیل کے وقت کا ایک خاص نبوی عمل تھا جو ”صفر“ سے شروع ہوا اور چند سالوں کے اندر پوری کامیابی کے ساتھ اپنے کمال کو پہنچا اور زمین کا دھارا تبدیل کر جانے کی بنیاد رکھ گیا۔ البتہ بعد کی صدیوں میں صالحین نے صرف ”دی ہوئی صورت حال“ given situation میں ہی اپنا بہترین ادا کیا (نہ ’صفر‘ سے آغاز کا فلسفہ پیش کیا اور نہ ’سو‘ تک پہنچانے والا کوئی ’انقلابی‘ تصور؛ جبکہ ”خلافت“ کے بھی احکام بیان کیے اور ”دین“ کو زمانے میں ”غالب“ کرنے سے بھی سروکار رکھا) البتہ عملی میدان میں صورت حال کو ”مجموعی طور پر“ ہی بہتری کی جانب بڑھایا جس سے بڑی بڑی اعلیٰ صورت حال بھی کسی وقت پیدا ہو جاتی رہی۔ ایسا ہی کردار آج بھی ہمیں ”دی ہوئی صورت حال“ given situation کے اندر ادا کرنا ہے جو اگر باحسن صورت ادا ہوتا ہے تو یہاں بہت سی تبدیلیاں آپ سے آپ وقوع پذیر ہو جاتی ہیں اور کچھ بعید نہیں معاملہ کسی دن ”خلافت“ تک بھی جا پہنچے۔ البتہ سب کام ”خلافت“ یا ”انقلاب“ کے اندر محصور جاننا اور خاص اسی کے لیے تحریک چلانا وہ اندازِ فکر ہے جو آپ کے بڑے بڑے صالح اور قابل نوجوان کو ’دروس‘ اور ’ڈرائنگ روم‘ کا اسیر اور معاشرے کے عملی محاذوں کے لحاظ سے عضوِ معطل بنا رکھنے کا سبب بنتا ہے؛ یعنی ایک طرح کا یو ٹوپیا۔

اثر انداز ہوں اور معاشرہ ان کی راہنمائی میں اپنی سمت پاتا چلا جائے... اور یہاں سے عالم اسلام کی سالمیت و استحکام کی جانب ہمارا حقیقی سفر شروع ہو۔ یوں بھی جس طرح ہمارا دیندار نوجوان جذبہ، صلاحیت اور فدائیت سے لبریز ہے، اللہ کے فضل سے وہ دنوں کے اندر یہاں پر پانسہ پلٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ اس عمل کو قیادت کی ایک اعلیٰ کھپ میسر آجائے۔

ہم اس جسارت پر معذرت خواہ ہیں، ”معاشرے میں اترنے“ کا یہ عمل جس قسم کے لوگ چاہتا ہے، دو طبقے اس کی ضرورت پر پورا نہیں اترتے:

1. ایک وہ طبقہ جو مغرب سے درآمد شدہ نظاموں کو ’اسلامی‘ ٹانکے لگانے کے فکری منہج پر کھڑا ہے۔ اسی کو ہمارے پچھلے ادارے میں ”ٹھیٹھ عقائدی لہجوں سے محروم تحریکی عمل“ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ یہ صورت قائمہ status quo سے کوئی بنیادی و اصولی اختلاف ہی نہیں رکھتا؛ نہ عالمی طور پر اور نہ مقامی طور پر؛ صورت قائمہ سے اس کی سارا شکوہ شکایت ”بدنیتی“ اور ”عملی عدم نفاذ“ کے حوالے سے ہے؛ اس کی شرکیہ بنیادیں تقریباً نظر سے روپوش ہوتی ہیں۔ بلکہ مسئلہ کو ”شُرک و توحید“ کی نظر سے دیکھنا ہی اس کے ہاں متروک ہے۔ بلکہ معیوب ہے! ”ٹھیٹھ عقائدی لہجوں“ سے محروم یہ طبقہ چاہے جتنے بھی اخلاص کے ساتھ میدان میں اترے (بلکہ اتر اہوا ہے) یہ نہ صرف یہاں کوئی حقیقی تبدیلی برپا نہ کر پائے گا بلکہ یہ صورت قائمہ کے ہاتھوں خود تبدیل ہوتا چلا جائے گا اور بعید نہیں ایک دن یہ اس کا دفاع کنندہ بن کر ہمیں قائل کرے کہ سب مل کر اس (غلط بنیاد پر قائم کی گئی) چیز کو ’عملاً‘ درست کر ڈالنے کا معجزہ کریں؛ کیونکہ اس میں مسئلہ ہے ہی ’عملی خرابی‘ کا! صاف بات ہے، یہاں میدان میں اترنے کے لیے ایک بے حد ٹھیٹھ فکری پیراڈائم درکار ہے؛ اس کے بغیر میدان کے اندر قدم دھرنا نمک کی کان میں نمک بننے والی بات ہے اور آخر میں صرف مشقت اور تھکن ہاتھ آنے کی ہے۔

2. دوسرا وہ طبقہ جو میدان میں اترنے کے لیے میدان پر اپنی ”شرط“ عائد کرے گا۔ ظاہر ہے میدان تو اس کا ضرور تمند نہیں یہ میدان کا ضرور تمند ہے؛ وہ اس کی شرط کیوں قبول کرے؟! کبھی یہ میدان ہمارا ہی تھا اور اس کے سب کھیل ہماری شرط پر کھیلے جاتے تھے، لیکن ہمارے ایک طویل خوابِ خرگوش میں چلے جانے کے بعد، جب میدان کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلا گیا ہے، فی الحال تو یہاں ہماری شرط مانی جانے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کو ”درمیانی مرحلہ“ کا نام دیا ہے۔⁶ ہماری خلافت وغیرہ کے بہت سے احکام جو ہمارے فقہاء نے بیان کیے ہیں وہ اُس سینارپو کو سامنے رکھ کر ہوئے ہیں⁷ جب میدان ہمارے پاس تھا⁸

⁶ دیکھئے اس سلسلہ میں ہمارا مضمون ”درمیانی مرحلہ کے بعض احکام“ (شمارہ اپریل تا جون 2013)

نیز واقعہ کیوسف کے حوالے سے ابن تیمیہ کی تقریر (شمارہ جولائی تا ستمبر 2013)

⁷ یہاں پر ہمارے کچھ اصحاب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ”خلافت کی غیر موجودگی“ کے حوالے سے آپ کی نظر ”مکی مرحلے“ کی طرف کیوں نہیں جاتی جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھی کسی طاقت اور اقتدار کے بغیر تھے؛ جو اعمال انہوں نے اُس وقت انجام دیے انہی کو مستقل طور پر ”خلافت کی غیر موجودگی کے احکام“ قرار دے لیجئے، معاملہ ختم۔ اس کے لیے آپ ”فقہ الموازنات“ وغیرہ ایسی اشیاء کی پریشانی کیوں اٹھاتے ہیں؟ ہمارا جواب بہت سادہ ہے: ”مکی مرحلہ“ میں وہ ڈیڑھ ارب کی امت کہیں نہیں پائی جاتی تھی جس کے مصالِح کی ہم بات کر رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے اپنے مٹھی بھر ساتھی فدائیت کی اعلیٰ ترین سطح پر پائے جاتے تھے۔ جبکہ ادھر زوال کی کھائی ہوئی، شعور سے تہی، جہالت میں ڈوبی، بد اعمالیوں میں پھنسی، دشمن کی چیرہ دستیوں سے لہولہان، اپنے بکاؤ مال سیاستدان کی ڈسی ہوئی، بیرون سے مسلط شدہ نصابوں، بھاڑے کے دانشوروں، کرائے کے میڈیا، این جی اوز کے غولوں اور ملٹی نیشنلز کے لشکروں کی یلغار تلے آئی ہوئی شرق تا غرب پھیلی ایک ”امت“ ہے جو قریب ہے کہ اپنی نسلیں کھودے اور اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھے... اور یہ تن داغ داغ امت ضرور تمند ہے کہ کوئی مہربان اس کو ہاتھ پکڑ کر چلائے؛ ہر جگہ اس کی مدد کو پہنچے اور ہر سطح پر اس کی راہنمائی کو موجود ہو؛ اور ایسا کرتے ہوئے اس کی

اور یہاں کے سب ندی نالے ہمارے ہی دیے ہوئے رخ پر بہتے تھے۔ لہذا ان اسباق کو بیان تو من و عن کیا جائے گا اور سعی تو میدان کو اسی نقشے پر بحال کروانے کے لیے کی جائے گی، اس معاملہ میں کوئی ”ری کونسل“ بھی قبول نہ کیا جائے گا جو سرے سے ہماری خلافت کو اس یو۔ این پیراڈائٹم میں فٹ کرالائے اور ہماری ”سمع و طاعت“ کو اس ’ووٹ، جلسے، جلوس‘ کی ملت سے ’ہم آہنگ‘ کروادے (اور یوں ہمارا کیس ہی سرے سے ختم کروادے؛ جو کہ اوپر کے نطقے میں بیان ہوا)... لہذا صورتِ قائمہ کو ”ما انزل اللہ“ کے مطابق ہونے کی سند تو ہرگز نہ دی جائے گی۔ البتہ یہاں کے سماجی عمل میں جن بھی شروط پر ممکن ہو، فی الحال حصہ لیا جائے گا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ کہ یہاں ایک امت پہلے سے وجود رکھتی ہے جس کی نسلوں کو ضائع اور جس کے مصالح کو معطل ہونے کے لیے چھوڑا ہی

کمزوریوں اور خامیوں کا پورا پورا لحاظ کرے۔ یہ وجہ ہے کہ اس صورتحال سے متعلقہ احکام لاگو کرنے کے حوالے سے ہماری نظر ”مکی مرحلے“ کی طرف نہیں جاتی جو آج یہاں کے کچھ طبقتوں کے لیے فکری تعیش اور ’یوٹوپیا‘ کی بنیاد فراہم کرنے لگا ہے۔ اس کے لیے ہماری نظر ”فقہ الموازنات“ اور ”آحوال تعارض الحسنات والسیئات“ کی طرف جاتی ہے؛ جس کے مختلف پہلو ہم امت کے مستند فقہاء و مجتہدین کے حوالوں کے ساتھ ایقاظ میں وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔

8 حتیٰ کہ ”غیر شرعی عدالتوں“ کی جانب رخ کرنے سے ممانعت کے احکام قرآن میں اُس وقت اترے تھے جب ”شرعی عدالتیں“ اپنی قوت نافذہ کے ساتھ معاشرے میں دستیاب کرادی گئی تھیں؛ اس سے پہلے ان اشیاء کو صرف نظریاتی سطح پر بیان کیا جاتا رہا تھا۔ لہذا تطبیقی پہلوؤں سے ان عزلت پسند حضرات کا ”بیان توحید“ جو ہماری آج کی صورتحال کے حوالے سے ہو رہا ہے کچھ نہایت سنگین الجھنیں پیدا کر کے دے رہا ہے۔ ہماری دانست میں کوئی ایک بھی منجھا ہوا عالم اس پورے ڈسکورس کو، جو اندریں حالات ہم پر سماجی شعبوں میں جانے کے راستے بند کرتا ہے، اپنی تائید سے نہیں نوازتا۔ سوائے سودی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں یا اس طرح کے کوئی اور ایک آدھ شعبے کے، شاید کوئی ایک بھی شعبہ ایسا نہیں جس کی ملازمت کو ”حرام“ کہنے کا فتویٰ کسی مقتدر عالم کے ہاں سے صادر ہوا ہو۔

نہیں جاسکتا۔ جتنا تحفظ ہو سکے اتنا ضرور کیا جائے گا۔ اور آج کی تاریخ میں ہی کیا جائے گا۔ اس عمل کے نتیجے میں معاشرے کی جتنی زمین ہاتھ آسکے اتنی ضرور قابو کی جائے گی۔ اگر حالت اسیری میں بھی مسلمانوں کے معاملات کو ممکنہ حد تک صالحین کے زیر ہدایت چلایا جانا ضروری ہے⁹ تو پھر حالت محکومی میں کیسے آپ مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ سکتے ہیں کہ جب تک خلافت نہیں آجاتی اور معاملات شریعت کے مطابق ”چلنا“ شروع نہیں ہو جاتے ہم تو یہاں کے سماجی شعبوں میں نہیں حصہ لینے کے؛ تب تک ہم تو اپنا ایمان بچائیں گے اور تمہارا اللہ حافظ! پھر جبکہ ابن تیمیہؒ ایسے ائمہ علم اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ ایک صالح باصلاحیت آدمی اگر کہیں پر اعلیٰ عہدیدار ہوتے ہوئے ظلم ختم نہیں بھی کر سکتا مگر ایک فاسد آدمی کے مقابلے پر یہ عہدہ قبول کرنے کی صورت میں وہ یہاں پر ظلم کم ضرور کر سکتا ہے تو اس کے لیے وہ عہدہ قبول کرنا نہ صرف درست ہے بلکہ خاص حالات میں واجب تک ہو سکتا ہے۔ جس پر وہ یوسف علیہ السلام کے عمل سے دلیل بھی لے کر آتے ہیں جو اپنی اعلیٰ تدبیری صلاحیتوں سے کام لے کر مصر میں حسب امکان بہتری لاتے چلے گئے یہاں تک کہ پورا معاملہ آپ کے ہاتھ میں آ رہا۔ یہی معاملہ اسی مصر کے اندر یوسف (صلاح الدین) ایوبی کے ہاتھوں دہرایا گیا (جسے ابن تیمیہ ”ملوک السنۃ“ میں شمار کرتے ہیں) جس نے کچھ

⁹ جیسے بابل کی اسیری میں بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا، جہاں دانیال وغیرہ ایسے صالحین نے اپنی امت کے معاملات کو حتی الامکان بہتری میں رکھنے کی کوشش کی۔ لہذا ایک بری سے بری صورت حال میں بھی صالحین کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کو ”قیادت“ فراہم کریں؛ جتنا ہو سکے اس کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیں اور اسے مفسدین فی الارض کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں۔ یہ تصور کر لینا کوئی درست بات نہیں کہ یا تو ہمارے پاس خلافت ہوتی ہے یا پھر مسجد اور ڈرائنگ روم، بیچ میں کوئی حالت نہیں! حالانکہ ان دونوں کے بیچ ان گنت صورتیں ممکن ہیں۔ غرض صالحین کا کام اپنے ”مسلم معاشرے“ کے روزمرہ امور کے معاملہ میں کبھی بھی معطل نہیں ہوتا خواہ صورت قائمہ پر وہ خود حاوی ہوں یا ان کا حریف۔

عرصہ تک فاطمی (رافضی) خلیفہ العاصد کی وزارت قبول کیے رکھی (اس سے پہلے صلاح الدین کے چچا اسد الدین شیر کوہ نے، جو کہ ایک نہایت صالح انسان تھا، وہ وزارت قبول کر رکھی تھی) البتہ اپنی صلاحیت، تدبیر اور دانائی سے کام لیتے ہوئے صلاح الدین اور اس کے ساتھیوں نے تھوڑے عرصے میں پورا پانسہ پلٹ ڈالا اور آخر مصر پر فاطمیوں کا خطبہ ختم کر کے عباسی خلافت کا خطبہ بحال کر دیا، یوں عالم اسلام کے ان خطوں کو بڑی صدیوں بعد بقیہ عالم اسلام کے ساتھ وحدت اور استحکام کی لڑی میں پرویا؛ جس سے معرکہ سحطین کے لیے راہ ہموار ہوئی اور آخر بیت المقدس مسلمانوں کو واپس ملا۔ غرض ہمارا یہ طبقہ بھی جو یہاں چلنے والے معاملات کو شریعت کے مطابق نہ پاتے ہوئے یہاں کے سماجی شعبوں سے کنارہ کشی کر رکھنے کے سوا کوئی شرعی راہنمائی نہیں پاتا... فی الوقت معاشرے کی سر زمین پر کوئی موثر کردار ادا کرنے والا نہیں۔

المختصر یہاں صالح کردار اور صالح عقیدہ کے لوگ چاہئیں مگر میدان کے اندر نہ کہ میدان کے باہر۔ میدان میں پائے جانے والے لوگ بغیر ایک ٹھیٹھ عقیدہ کے، اور ٹھیٹھ عقیدہ کے لوگ بغیر میدان کے؛ دونوں یہاں کام دینے کے نہیں۔ جبکہ اس وقت یہ دو ہی طبقے پائے جاتے ہیں۔ الاما شاء اللہ۔

ایقظا یہاں پر جعفر شیخ ادریس، سفر الحوالی اور صلاح الصاوی وغیرہ ایسے مفکرین کے دیے ہوئے خطوط پر نوجوانوں کو وہ راہ دکھانے کے لیے کوشاں ہے جو ان دونوں ماڈلز سے ہٹ کر ہے، {یا جہاں یہ دونوں دھارے ایک ذہنی تبدیلی سے گزر کر یکجا ہو جاتے ہیں (گو، ہمارے خیال میں، ان کے ”یکجا“ ہونے پر وقت لگے گا... جو کہ ان شاء اللہ العزیز ایک کمال پیش رفت ہوگی)}:

یہ وہ راستہ ہے جہاں صالح عقیدہ حجروں اور بند کمروں میں محصور رہنے کی بجائے سماجی عمل میں اترتا ہے۔ کسی ”خلافت“ یا ”انقلاب“ سے ذہنی طور پر وابستہ کر کے لوگوں کو ایک وہمی دنیا کا باشندہ بنانے یا ”عقیدہ“ کے نام پر یہاں کی اکثر سیاسی و انتظامی

سرگرمی کو ”حرام“ ٹھہرانے کی بجائے... لوگوں کو صالح علم، صالح عقیدہ اور صالح تربیت سے آراستہ کرتا اور پھر ایسے تیار شدہ نفوس کا ’ذخیرہ‘ کرنے اور کسی موہوم واقعہ¹⁰ سے ان کی امیدیں بندھوا رکھنے کی بجائے، ساتھ ساتھ ان کو سماجی عمل میں اتارتا چلا جاتا ہے بلکہ ان سماجی شعبوں کے اندر اوپر تک پہنچنے کی تلقین کرتا ہے۔ یا پھر پہلے سے سماجی شعبوں میں پائے جانے والے کامیاب باصلاحیت نفوس کو، ان کے متعلقہ شعبے سے نکالے یا بد دل کیے بغیر، صالح علم، صالح عقیدہ اور صالح تربیت سے آراستہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک معاشرے کی ”سمت“ پر اثر انداز ہونے نیز حق کے لیے ”سماجی قوت“ اور ”سیاسی تائید“ پیدا کرانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ نہ ”ٹھیٹھ تصورات“ کی قربانی اس وقت (یا کسی بھی وقت) ہمارے وارے کی ہے (کیونکہ اس کے بغیر ہماری سیاسی و انتظامی محنت نری مشقت ہے) اور نہ ”میدان“ کی قربانی (کیونکہ اس کے بغیر ہمارے ’ٹھیٹھ‘ اور ’مستند‘ تصورات بھی ایک طرح کا یوٹوپیا ہی بنتے ہیں)۔

یہ ہے وہ وزن جو ایقظا یہاں کے عمل پسند نوجوان کو حالیہ صورتحال کے اندر دینا چاہتا ہے، گو اس سے پہلے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ دو نکاتی ترجیح اس پر واضح ہو جائے جو ابتداء میں بیان ہوئی۔

¹⁰ ظاہر ہے اس دوران کوئی موہوم واقعہ، اگر رونما ہو جاتا ہے... مثلاً کسی ملک میں ”اہل قوت“ کا کھل کھلا کر یا درپردہ اسلامی ایجنڈا کی پشت پر آجانا، اور جس کے لیے کوشش بھی ضرور کرنی چاہئے، یا مثلاً کسی الیکشن میں ہی مسلمان میدان مار لیتے ہیں، یا کوئی عوامی تحریر سکوائر، کوئی پیش رفت کر دکھاتا ہے... تو اس کا ہمارے بیان کردہ اس منہج سے کوئی تعارض نہیں، کیونکہ خود ہمارے اس منہج میں یہاں کے سیاسی و انتظامی و عسکری و صحافتی و عوامی شعبوں پر اسلام کے فی زمانہ تقاضے واضح کرنا اور ان کو اسلام کے لانگ ٹرم و شارٹ ٹرم اہداف پر آمادہ کرنا واضح طور پر شامل ہے۔ البتہ کسی مقتدر طبقے سے کچھ خاص امیدیں وابستہ کر رکھنے کو ”منہج“ بلکہ اسلام کا ’واحد صحیح منہج‘ قرار دینا اور اس کے علاوہ سب منہج کو ’خلاف سنت‘ قرار دینا ضرور ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

پس اگر یہ طے ہو جاتا ہے کہ معاشرے کے ایک ایک فورم پر ہمارا سرگرم ہو جانا ضروری ہے اور یہاں کے ہر ہر شعبے میں ہمارا جا اترنا ناگزیر... اور یہ کام نہ صرف جائز بلکہ اس وقت ہمارے دین کی ایک اہم ضرورت اور تقاضا ہے... تو پھر ہماری کل توجہ اور پریشانی یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نفوس جن کو معاشرے کے ان سب فورمز پر جانا ہے ان کی نظریاتی خوراک کا بندوبست کیونکر کیا جائے؟

آپ کا یہ فرد جسے معاشرے میں اترنا ہے اور بظاہر معاشرے میں ’تحلیل‘ ہو جانا ہے... اس کا معاشرے میں اترنا اُس وقت تک بے فائدہ ہے جب تک یہ ”صورتِ قائمہ“ کو بدل دینے کا پورا ایک سافٹ ویئر نہ بنا لیا جائے: اعمال، اخلاق، اطوار اور سب سے بڑھ کر ”عقیدہ“ میں۔ حق یہ ہے کہ اس کے اعمال، اخلاق اور اطوار اگر اس کو ماحول میں ایک محبوب شخصیت بنانے والی چیز ہیں تو اس کا عقیدہ وہ چیز جو اس کو وہاں گم ہونے سے بچائے گی، یعنی جو اس کو نمک کی کان میں نمک ہونے سے روکے گی اور اپنے ”مقاصد“ کے لحاظ سے اس کو وہاں پر ”اثر انداز“ ہونے کی پوزیشن میں لے کر آئے گی۔ پس وہ چیز جو اس ”تبدیلی“ کی اساس بنے گی وہ ”اعتقاد“ پر اس کی محنت ہے۔ یہ اس کے وہ ٹھیٹھ نظریات ہیں جو قدم قدم پر اس کو صورتِ قائمہ status quo سے ایک بالکل مختلف چیز بنا کر رکھتے ہیں اور اس کو مسلسل یہاں پر اس کا مشن یاد دلاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہتے اس کی زندگی یہاں پر اس بات کے دم سے ہے کہ ”توحید“ اس کی رگ رگ میں سرایت کر جائے اور ”رسالتِ محمد ﷺ“ پر ایمان رکھنے کی وہ دلائل جو صورتِ قائمہ سے اس کا اختلاف کرواتی ہیں اس کے تصور میں کوٹ کوٹ کر بھر دی جائیں۔ درست ہے کہ صورتِ قائمہ status quo سے منسلک مسلمانوں کو لاعلمی یا انسانی کمزوریوں کے باعث یہ ڈھیروں عذر دے گا اور ان کے ساتھ اپنے ایمانی رشتے کے باعث ان سے اپنی محبت اور وابستگی بھی برقرار رکھے گا بلکہ اپنی اس محبت سے ان کے دل بھی جیتے گا اور ان کے لیے اپنی ہمدردی اور خیر خواہی بھی ثابت کرے گا، لیکن خود یہ صورتِ قائمہ جس کو بدلنے کے لیے یہ میدان میں اترتا ہے، کہاں سے پھوٹتی ہے اور اس کے ڈانڈے

کہاں کہاں جاتے ہیں اور وہ اس کے ”دین“ کے ساتھ کہاں کہاں متصادم ہیں، یہ البتہ اس پر بے حد واضح ہونا ہے اور اس سے اس کے ذہنی فاصلے پوری طرح برقرار رہنے ہیں۔ یہ فاصلے اگر سمٹنے لگتے ہیں، یعنی صورتِ قائمہ کے ساتھ ہی اس کا ’ری کون سا کس‘ ہونے لگتا ہے تو پھر البتہ یہ سب محنتِ فضول ہے اور تب ”مسجد اور ڈرائنگ روم“ میں بیٹھ کر خالص دین کی باتیں کرنا اس ’معاشرے میں اترنے‘ والے جھنجھٹ سے کہیں بہتر ہے۔ لہذا اس عمل کی کل جان ”اعتقاد“ پر محنت میں ہے۔ اس کا سارا مونٹم ”توحید، رسالت اور آخرت“ کے اُن معانی اور دلائلوں کو اذہان کے اندر گہرا اتارنے میں ہے جو آج کی اس صورتِ قائمہ سے قدم قدم پر الجھتی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے وہ شخص جس کو سماجی شعبوں میں اتر کر معاشرے میں اپنا کوئی دینی کردار ادا کرنا ہے وہ ”عقیدہ“ پر مبنی تعلیم اور تربیت پانے کا اس شخص کی نسبت کہیں بڑھ کر ضرور تمند ہے جسے ”عقیدہ“ کے یہ اسباق صرف مسجد اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دہرانے ہیں۔ اس نوجوان کے لیے تو یہ کہیں زیادہ ضروری ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایسے اساتذہ اور ایسے ماحول سے وابستہ کرے جہاں اس کو ”ایمان“ کے خالص ترین اور قوی ترین معانی تازہ بہ تازہ ملتے رہیں؛ خصوصاً یہ بات کہ ”تعلیم“ کا عمل اگر ایک بار کے لیے ہے تو ”تذکیر“ کی کوئی صورت ہر دم برقرار رہنی چاہئے جس کی سب سے اعلیٰ صورت قرآنی مجالس ہیں۔ المختصر، معاشرے میں آپ کی تمام تر پیش قدمی اس بات سے وابستہ ہے کہ آپ کا تصور دین کس قدر صحیح، کس قدر کھرا اور کس قدر واضح ہے۔ یہاں تھوڑی سی آلائش بھی ہوئی تو وہ معاملے کی سب ترتیب الٹ کر رکھ دینے کا موجب ہو سکتی ہے۔ یہاں؛ ”تصوراتِ دین“ میں البتہ اگر کوئی جھول یا کوئی غموض ہے تو اغلب امکان یہی ہے کہ آپ کی ”پیش قدمی“ یہاں پر کچھ نہ کچھ اگر ہو بھی جائے تو آپ کے ”دین“ اور آپ کے ”مقاصد“ کے لیے اس میں خوش ہونے کی پھر بھی کوئی بات نہ ہو!

ہمارا دشمن بلاشبہ ’رائے عامہ‘ کی معتقد ہماری تحریکوں کے لیے کسی کسی وقت ایسی صورت پیدا کرتا ہے جہاں یہ ”بظاہر کامیابی“ کی راہ سے ”ناکامی“ تک پہنچیں۔ اس

واقعے کے پیچھے دراصل یہی کہانی ہوتی ہے: ’راستہ‘ چلتے چلتے، ’محرکات‘ اتنے بے جان ہو چکے ہوتے ہیں کہ ’منزل‘ کی ہزاروں تفسیریں ممکن ہو جاتی ہیں! ان تحریکوں کی مثال ویسی ہو جاتی ہے جیسے آدمی اپنے کسی عزیز کو ٹرین پر سوار کروانے جائے اور وہاں کی گہما گہمی میں ہوش کھو کر خود سوار ہو جائے اور اصل مسافر پیچھے رہ جائے! ان تحریکوں کے اصل مقاصد ’سوار‘ ہوئے بغیر رہ جاتے ہیں البتہ یہ بڑی دور دور تک کا ’سفر‘ کر آتی ہیں اور کسی کسی وقت تو ’آخری سٹیشن‘ تک کو ہاتھ لگا آتی ہیں، جبکہ ’مقاصد‘ پیچھے کتابوں کی ’انتظار گاہ‘ میں پڑے گرد آلود ہوتے رہتے ہیں! البتہ وقت ایسی بے رحم چیز ہے کہ اس دوران ان کے بوڑھے دنیا سے رخصت، جوان بوڑھے اور بچے جوان ہو چکے ہوتے ہیں؛ یعنی بالکل ایک نئی نسل جس نے ہوش ہی اس ’سفر‘ کے دوران سنبھالی ہوتی ہے اور وہ کسی کے ’پیچھے‘ رہ جانے کا سن کر اچھی خاصی الجھن کا شکار ہوتی ہے؛ کہ دنیا ’آگے‘ جاتی ہے اور آپ بار بار ’پیچھے‘ کی بات کرتے ہیں! اب کون اس نئی پود کو سمجھائے کہ وہ چیز جو اس پورے سفر کا محرک اور باعث بنی تھی پیچھے کہیں گم ہو گئی ہے اور وہ ایک اچھی خاصی اہم چیز ہے!

بلاشبہ آپ کو یہاں ’رائے عامہ‘ سے بھی سروکار رکھنا ہے۔ ’حالات‘ کی نبض پر بھی ہاتھ رکھنا ہے۔ ’دستیاب مواقع‘ سے بھی فائدہ اٹھانا ہے۔ ’منجائشیں‘ بھی تلاش کرنی ہیں۔ ’مصالح‘ بھی دیکھنے ہیں۔ ’مفاسد‘ کو بھی دفع کرنا ہے۔ ’کمتر برائی‘ کا فقہی قاعدہ بھی بہت سے مقامات پر لاگو کرنا ہے اور جو کہ بلاشبہ ایک معتبر قاعدہ ہے۔ ایسی ایسی صورت حال میں پورا اترنا ہوتا ہے کہ جہاں سب کچھ زبان پر لایا ہی نہیں جاسکتا... یہ سب درست ہے اور بلاشبہ اس راستے میں آپ کو یہ سب امور اختیار کرنا ہوتے ہیں۔ تو پھر یہاں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ کے نوجوان میں ’عقیدہ‘ کہیں زیادہ راسخ ہو۔ دین کی برہنہ حقیقتوں کو جاننے اور ذہن نشین کرنے پر آپ کے نوجوان کی محنت اُس نوجوان سے کہیں بڑھ کر ہونی چاہئے جس کو میدان سے باہر بیٹھ کر آپ کے اس نوجوان پر ’بحق‘ عقیدہ، تنقید کرنی ہے۔ پس ’تصورِ دین‘ پر شدید ترین محنت یہاں معاملے کا پانسہ پلٹنے

کے لیے بنیادی ترین چیز ہے۔ اس میں آپ کو آخری درجے کا ٹھیٹ اور بے لحاظ ہونا ہے۔ یہاں پر جتنی پختگی پیدا کرالی جائے گی اتنا ہی راستے کے گڑھوں سے بچ کر گزرنا آپ کے حق میں اللہ کے فضل سے یقینی ہوتا چلا جائے گا اور صرف اسی صورت میں ”آپ کی پیش قدمی“ یہاں ”آپ کے مقاصد کی پیش قدمی“ کی ضمانت ہوگی۔ تبھی یہ ممکن ہو گا کہ ”آپ کی کامیابی“ یہاں ”آپ کے عقیدہ کی کامیابی“ بنتی چلی جائے۔ بصورتِ دیگر صرف ”مشقت“ ہے جو ایک لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد آپ کے ہاتھ آتی ہے... اور جو کہ ایک تحریکی عمل کے حق میں بدترین ’آؤٹ کم‘ ہے۔

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ دین کی خاطر ہونے والی آپ کی سیاسی و سماجی سرگرمی آپ کے وقت اور توانائیوں کا ضیاع نہ ہو تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ ”شُرک اور توحید“ کے مسئلہ پر آپ کے نوجوان کو بہت زیادہ محنت کرائی گئی ہو۔ اس میں اہل سنت کے تاریخی ڈسکورس کو حرف بہ حرف بنیاد بنایا گیا ہو اور پھر اپنے زمانے کی شرکیات کو اسی کے تسلسل میں لاکر سمجھا اور سمجھایا گیا ہو۔

آپ کے تحریکی نوجوان کے نظریاتی رختِ سفر کے حوالے سے سب سے اہم بات... یہ کہ:

’اسلام کا نفاذ‘، ’شریعت کی حکمرانی‘، ’اسلامی ریاست‘ اور ’اسلامی نظام‘ وغیرہ ایسی عبارتوں کو فی زمانہ کچھ مہمل الفاظ جانئے... جب تک آپ کے نوجوان کو ان سب حوالوں سے ”جاہلیت“ کی صحیح پہچان نہیں ہو جاتی۔ یہاں کے ایک ایک اہم موضوع پر جب تک اس نوجوان پر یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ ”اسلام“ اور ”جاہلیت“ کے کانٹے کہاں کہاں الگ ہوتے ہیں اُس وقت تک آپ کے ”اسلامی مقاصد“ کچھ ’نیک تمناؤں‘ سے بڑھ کر کوئی عملی دلالت نہیں رکھتے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ جا بجا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

إِنَّمَا تَنْقُضُ عُرَى الْإِسْلَامِ عُرْوَةً عُرْوَةً، إِذَا نَشَأَ فِي الْإِسْلَامِ مَنْ لَمْ يَعْرِفِ الْجَاهِلِيَّةَ.

اسلام کی زنجیر تو اسی وقت کڑی کڑی کر کے ٹوٹنے لگے گی جب یہاں ایسی نسلیں پروان چڑھنے لگیں جو جاہلیت سے ناواقف تھیں۔

پس ہر باب میں یہاں آپ کو ان مقامات کا تعین کرنا اور انہیں خوب ذہن نشین کرنا ہے جہاں اسلام اور جاہلیت کے کانٹے الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ مقامات آپ کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں تو آپ کا تصور اسلام سراسر بے جہت ہے۔ ایسے میں آپ جتنے مرضی 'اسلامی علوم' پر عبور پائیں اور جتنے مرضی 'نیکی' کے اسباق پڑھیں اور پڑھائیں بلکہ جتنے مرضی 'نفاذ اسلام' کے مطالبے کریں اور 'قرآنی دروس' کے ملک گیر یا عالم گیر جال پھیلائیں... اول تو آپ کی جدوجہد کا کوئی رخ ہی نہیں بنے گا اور آپ کی اٹھان میں وہ زور ہی نہیں آئے گا جو اس عمل کو معاشرے کے اندر مطلوب ہے۔ اور اگر کوئی جوش اور ولولہ کسی تدبیر سے پیدا کر ہی لیا جائے تو بھی جاہلیت بڑی آسانی سے آپ کے ساتھ ہاتھ کر جائے گی۔ ہاں جس دن آپ پر شرک و توحید اور اسلام و جاہلیت کے "مفارق" splitting spots بہت واضح ہوئے اُس دن آپ کے فکری استحصال کے راستے یقینی طور پر مسدود ہو جائیں گے؛ یعنی جاہلیت آپ کو بھٹکانے میں آخری حد تک بے بس ہو جائے گی۔ "پیش قدمی" کی استعداد آپ کے اندر کتنی ہے، یہ تو آپ کے جذبے اور صلاحیت پر ہے، اور اس کا خاصا تعلق دستیاب مواقع سے بھی، خصوصاً یہ کہ آپ کو اس سفر میں کس معیار کے لوگوں کی رفاقت میسر رہی... تاہم "نظریاتی پختگی" کی یہ شرط پوری کر لینے کے نتیجے میں آپ اس خطرے سے باہر آجاتے ہیں کہ آپ کی منزل کسی سمت میں ہو اور آپ کا جوش و ولولہ اور آپ کی پیش قدمی کسی اور سمت۔ یہاں آپ تیز چلتے ہیں یا آہستہ، یہ تو آپ پر ہے یا پھر حالات پر ہے، البتہ آپ اپنے راستے پر ضرور رہتے ہیں اور کسی دوسرے کو اُس کا راستہ چل کر دینے کی مشقت سے محفوظ ضرور رہتے ہیں۔

یہ ہے ”اعتقاد کی پختگی“۔ ایک ایسی عظیم چیز جس کا ادراک کرنے سے بھی عموماً ہم قاصر ہیں۔ اس کے ساتھ چیونٹی کی چال چلنے والا آدمی اس شخص سے بہت آگے ہے جو اس کے بغیر سرپٹ بھاگ رہا ہے۔

قارئین! ہمارا یہ ادارہ تو ”نظریاتی پختگی“ کی عمومی جہتوں سے ہی متعلق ہے۔ البتہ حالیہ شمارہ میں سامنے لائے جانے والے ایک موضوع کی جانب ہم یہیں پر آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہیں گے۔

گزشتہ ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران... مسلم ”شناخت“ اور ”وابستگی“ کے حوالے سے ایک موضوع متعدد زاویوں سے ابھر کر سامنے آیا ہے، جو کہ یوں بھی ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھتا ہی رہتا ہے۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر کوئی آج اس سوال کا جواب چاہتا ہے کہ ”ہم“ کون ہیں اور اس بھرے جہان میں ”ہماری“ اصل شناخت کیا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا سوال نہیں۔ اس ”ہم“ کے تعین پر بے شمار موضوعات کا انحصار ہے؛ اور اس کے مختلف جوابات سے مختلف راستے پھوٹتے ہیں اور ایسے ایسے مختلف قافلے بنتے ہیں جیسے مشرق اور مغرب کا فاصلہ یا جیسے رات اور دن کا فرق۔ اس ”ہم“ کے سوال پر آپ لاکھوں سے کروڑوں میں اور کروڑوں سے اربوں میں چلے جاتے ہیں یا پھر اربوں سے لاکھوں اور ہزاروں پر آجاتے ہیں۔ عین اسی مقام سے ہی آپ یہ تعین کرتے ہیں کہ اسلام میں ”سوسائٹی“ کا کیا تصور ہے اور وہ اس وقت پڑھائے جانے والے جاہلی تصور سے کس قدر مختلف ہے؟ ”ریاست“ کیا ہے؟ ”اجتماع“ کیا ہے؟ ”افتراق“ کیا ہے؟ اور اس کے بیان کردہ ”اجتماع“ سے متعلقہ مباحث کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ”رشتے“ اور ان کی ”حیثیت“ کیونکر متعین ہوتی ہے؟ اور پھر یہیں سے کتابوں کے نزول اور انبیاء کی بعثت تک ایسے موضوع اس کے ساتھ جڑتے چلے جاتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں پیش آنے والے حالیہ افسوسناک واقعات نے جہاں بہت سے بظاہر ’مندمل‘ زخموں کو ہرا کیا ہے وہاں بہت سی ’متروک‘ بحثوں کو جنم دیا ہے جن میں سے بعض آپ نے ذرائع ابلاغ پر بھی ملاحظہ فرمائی ہوں گی۔ ”سندھ“ کا مسئلہ اٹھایا گیا اور

اس پر ”حمیت“ کے کچھ بھرپور مظاہرے سامنے آئے، تو یہ بحثیں بھی ہوتے ہوتے اسی ایک بڑے مسئلے پر پہنچا گئیں کہ ”اجتماع“ کی اصل بنیادیں ہیں کیا؟ ملت کیا ہے اور ملت کے ”ثانوی فرقوں“ secondary divisions کی حدود اور قیود اصولاً ہیں کیا؟ یہاں ’بلوچستان‘ کا مسئلہ ہر چند دن بعد اٹھالایا جاتا ہے جس کے اندر سے یہ سوال پھر ابھر آتا ہے کہ ان مختلف رنگوں اور نسلوں کو جوڑنے والی اصل حقیقی چیز کیا ہے اور وہ ”چیز“ اگر کوئی اصول ہے تو قدم قدم پر تضادات کا شکار کیوں ہے؟ امریکی طاغوت کے خطے سے نکلنے کی صورت میں جو ایک اسلامی وحدت ہمیں ایشیائی پاکستان سے لے کر وسط ایشیا تک جاتی دکھائی دیتی ہے (جلد یادیر) اُس سے ”امت“ کی توقعات وابستہ کرنے میں کہاں تک جایا جاسکتا ہے اور ”امت“ کی نفی کرنے والے عوامل کی خدا کی میزان میں کیا حیثیت ہے؟ نیز اس متوقع (باذن اللہ) وسط ایشیا تالاہور و کراچی ”اسلامی وحدت“ کی دلائل سری نگر، دہلی اور دکن کے لالہ اللہ پڑھنے والوں کے حق میں کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر اہم سوال...: یو۔ این کے عائد کردہ اعتقادات اور فرائض و شرائع کی حیثیت مسلمان کی نظر میں کیا ہونی چاہئے؟

(یہاں ہم صرف مسلمان کی نظر سے ”دیکھنے“ کی بات کر رہے ہیں، عملاً ہم اس وقت جہاں ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہے؛ اور اس کی بابت ہمیں کوئی جلدی نہیں؛ تاہم ہمارا یقین ہے کہ ”مسلمان“ کی صرف ایک ”نظر“ ہی درست کر دی جائے تو اس کے گرد و پیش کا نقشہ تبدیل ہونے میں کوئی بہت زمانے درکار نہیں۔ البتہ خدشہ ہے کہ ”نظر“ کی بیڑیاں توڑنے میں زمانے گزر جائیں کیونکہ ان بیڑیوں پر آیات و احادیث کے حوالے بھی جا بجا دے لیے گئے ہیں؛ اور ہمارا اصل المیہ بھی شاید یہی ہے۔)

اُدھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھارت آپ کی ’عالمی برادری‘ میں ویٹو پاور کے ”استحقاق“ کا اعادہ کرنے لگا ہے جس کی بڑی وجہ وہ اپنی ’ایک ارب سے زائد آبادی‘ اور ’وسیع و عریض رقبہ‘ بتاتا ہے؛ جس کا مطلب ہے کہ خود آپ کی اس شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلانے والی ’عالمی برادری‘ کے ہاں ’ایک ارب سے زائد آبادی‘

اور ’وسیع و عریض رقبہ‘ فضیلت اور برتری کی کوئی بنیاد ضرور ہے جیسی تو بھارت اس کا حوالہ دے کر سلامتی کونسل میں ”ویٹوپاور“ مانگتا ہے! یہاں پھر آپ کے سامنے اس ”ہم“ کا سوال آکھڑا ہوتا ہے جس کا کوئی جواب ’لاکھوں‘ میں آئے گا تو کوئی جواب ’کروڑوں‘ میں تو کوئی جواب ”ڈیڑھ ارب سے زائد“ میں۔ یہاں پھر...، ہمیں ”واقعات“ کے میدان میں کسی چیز کی کوئی جلدی نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں ہم اپنے اس ہدف سے بہت دور ہیں... کیونکہ ہم تو ابھی تک اُس پہلے سوال کا ہی جواب نہیں دے پائے جو ہمیں اپنی درست ”شناخت“ میں مدد دے سکے اور ہم پر واضح کر سکے کہ اس دنیا میں ”ہم“ ہیں کون!

ادھر آپ کی اسی ’عالمی برادری‘ میں جہاں بھارت کسی قرض خواہ بننے کی طرح پل پل بعد ”ویٹوپاور“ کے تقاضے کرنے لگا ہے، کچھ نسبتاً ’بڑے رقبے‘ اور ”بڑی آبادی“ کے مسلمان ملکوں کے سائز کترنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ مستقبل قریب کے عالم اسلام کے کچھ ’نقشے‘، واشنگٹن پوسٹ اور نیویارک ٹائمز ایسے مقتدر ذرائع ابلاغ میں چھپتے ہیں!

یہاں ضروری ہو جاتا ہے کہ ”اجتماع“ کے مباحث کچھ اصولی بنیادوں پر مسلمان کے لیے واضح ہو جائیں اور یہاں کے نام نہاد ’اسلامی‘ ہیومن اسٹوں کے کیس کو دریا برد کروادیا جائے جو ظلم اور شرک کے اس عالمی راج گھاٹ کو کتاب و سنت کی دلیلوں سے مزین کرنے میں لگے ہیں۔ ہمارا ماننا ہے کہ فی الوقت جو تعامل interaction ہے وہ تو ہمیں دی گئی حقیقتوں given realities کے ساتھ ہی کرنا ہے۔ یعنی ایک عرصہ تک اس ’یو۔ این کمیونٹی‘ کے ساتھ ہی نباہ کرنا ہے کیونکہ صدیوں کی غفلت کے خمیازے سے دنوں میں جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔ لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مسئلہ کو دیکھیں تک اُن کی نظر سے؟ اور کب تک؟

یہ موضوعات جو بنیادی طور پر ”الجماعۃ“ سے متعلق ہیں (اور جو کہ ہم پر خدا کی جانب سے عائد فرض ہے بلکہ ”مسلمان“ ہونے کی ہی ایک جہت ہے)، مسلم زندگی میں روز بروز

اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یوں بھی ہم ان موضوعات کو کھولنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اسی دوران ابن تیمیہ کی تصنیف ”خلافت و ملوکیت“ پر کام کرنے کے دوران ہم پر کھلا کہ اس امام نے اپنی تصنیف کی ابتدائی فصول میں بہت اختصار کے ساتھ سہی ہماری آج کی ضرورت کے کچھ نہایت بنیادی مباحث سمودیے ہیں۔ یہاں سے؛ ضروری معلوم ہوا کہ دورِ حاضر کے ہیومن اسٹ پیراڈاٹم کو مسلسل زیرِ موازنہ رکھتے ہوئے ابن تیمیہ کے بیان کردہ ان ایمانی مباحث کو اس حد تک کھول دیا جائے کہ ان نقاط کا تعین ہو جائے جہاں ”شناخت“، ”اجتماع“ اور ”تقسیم آدمیت“ ایسے موضوعات میں فی زمانہ اسلام اور جاہلیت کے کانٹے الگ ہوتے ہیں تاکہ کچھ اشیاء کو ہم عین بنیاد سے اور اپنے دور کی گمراہیوں کی نسبت سے سمجھ سکیں... اور توحید کی کچھ اساسی دلائل میں فی زمانہ ہم پر واضح ہو جائیں۔ ”خلافت“ اور ”امارت“ وغیرہ ایسی اشیاء جو ابن تیمیہ کی تصنیف میں بعد کی فصول میں بیان ہوئیں، دراصل ان بنیادی مسائل کو طے کرنے کے بعد سمجھ آنے والی باتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، ان طبقوں کی پھیلائی ہوئی الجھنوں کو سلجھانا بھی ضروری تھا جن کو ہم نے اپنے اس بیان میں ’اسلامی ہیومن اسٹ‘ یا ’جدید اعترالی رجحانات‘ کا نام دیا ہے، کیونکہ ان کے دیے ہوئے ڈسکورس کے نتیجے میں ہمارے دین کے اکثر مفہومات مغرب کے دیے ہوئے ماڈرنسٹ پیراڈاٹم میں فٹ ہوتے چلے جاتے ہیں اور ”اسلام“ ایسی برگزیدہ حقیقت اُسی کے فریم میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ پہلی دو فصول پر ہماری تعلیقات کچھ طویل ہو گئی ہیں کیونکہ یہی اس تصنیف کی اصل بنیاد foundation ہیں۔ حالیہ شمارہ میں صرف اس کی پہلی فصل مع تعلیقات ہیں۔ اس کی باقی فصول آئندہ شمارہ میں آئیں گی، ان شاء اللہ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس پر ہمیں اپنی آراء یا استفسارات سے آگاہ فرمائیں تاکہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت سے پہلے ان مباحث کو مزید فائدہ مند بنایا جاسکے۔ ان تحریروں کو اگر آپ مفید پائیں تو اپنے حلقہٴ احباب سے براہ کرم ان کو توجہ لے کر دیجئے۔